سیرتِ نبویؐ

قرآن حکیم کی روشنی میں

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن حکیم کی روشنی میں

تقاریر: مولانا سید وصی مظہر ندوی

★ مرشد کے معانی - ص 6
★ خوش خلق ص 21
★ صبر 21
★ دعوت کے لیے قیام الیل کا حکم 32

سیرۃِ نبوی
قرآن حکیم کی روشنی میں

جدہ ریڈیو سے نشر شدہ
۹ تقاریر کا مجموعہ

مولانا سیّد وصی مظہر ندوی

طبع اوّل — تعداد ۲۰۰۰

تاریخ اشاعت : ۹ فروری ۱۹۸۳ - ۲۵ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ

قیمت :

ناشر : قمر سعید قریشی

مطبع : مکتبہ جدید پریس - لاہور

ملنے کا پتہ : مدرسہ جامعہ اسلامیہ
ٹھنڈی سڑک حیدر آباد (سندھ)

پیش لفظ

۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں جب مجھے حج بیت اللہ اور عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی تو جدّہ ریڈیو میں مشرقی زبانوں کے پروگرام کے نگرانِ اعلیٰ جناب نصار رفیع الکیانی کی تحریک اور وزیرِ اطلاعات و نشریات محترم جناب ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی کی حوصلہ افزائی کی بنا پر جدّہ ریڈیو سے "سیرتِ نبوی قرآن حکیم کی روشنی میں" کے عنوان سے میری تقریروں کا ایک سلسلہ نشر ہوا - ان میں سے بعض تقریریں "فاران" کراچی اور "میثاق" لاہور میں شائع بھی ہوئیں -

ویسے تو ریڈیائی پروگرام ہونے کی وجہ سے ان تقریروں میں ٹھوس اور علمی انداز اختیار کرنا نہ تو ممکن تھا اور نہ مناسب - تاہم اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ ایک ایسی کوشش ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے -

ان تقاریر کے ذریعہ ایک طرف سیرتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم) کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے - دوسری طرف ان کے ذریعہ قرآن فہمی میں بھی مدد ملتی ہے -

میں نے ان تقاریر کے ذریعہ یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی انقلاب کن مراحل سے گزرتا ہوا کامیابی کی منزل تک پہنچتا ہے ہر مرحلے کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور اسلامی انقلاب کے علمبرداروں کو ان مختلف مرحلوں میں کن حالات سے گذرنا پڑتا ہے -

چالیس کے قریب تقاریر میں سے سردست ۹ کا یہ مجموعہ حاضر ہے۔ موجودہ ہنگامی زندگی سے نجات ملے تو باقی تقاریر کے ساتھ ان سب کو یکجا شائع کیا جائے۔ جس طرح اس سے قبل میری کتاب "دعوت اسلامی تاریخ کے آئینہ میں" شائع ہو چکی ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے ضمن میں عزیزم جناب عاکف سعید صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کی کتابت، تصحیح اور طباعت کی نگرانی کی۔ آخر میں، میں جدہ ریڈیو اور اس کے ڈائریکٹر جناب حسین محمد العسکری کا شکر گزار ہوں جن کی اجازت سے یہ مجموعہ اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

وصی مظہر
(حیدر آباد)

آنحضرتؐ کی زندگی نبوّت سے قبل

الحمد للّٰہ العلی العظیم و الصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہٖ محمد الامین و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین ۰

سیرت رسولؐ اور قرآن حکیم

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر ہر مسلمان کو چلنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے قدرتی طور پر ہر مسلمان کے دل میں حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو معلوم کرنے کا ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے اور پیدا ہونا چاہیئے۔ یہیں سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو معلوم کرنے کا سب سے مستند ذریعہ کیا ہے؟

اس سوال کا انتہائی حقیقت افروز جواب وہ ہے جو اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے دیا تھا۔ اُن سے کسی شخص نے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و اخلاق کے بارے میں پوچھا تو آپ نے نہایت حیرت سے خود اس پوچھنے والے سے دریافت کیا ....

اَمَا تَقْرَءُ الْقُرْاٰن ؟ کیا تو قرآن نہیں پڑھتا۔ پھر خود ہی کہا: کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰن ط (یعنی آپ کی سیرتِ مبارکہ کی مکمل تصویر قرآن ہے!)

اُمّ المؤمنینؓ کے اس ارشاد کی روشنی میں ہم نبوّت سے قبل اور

آغازِ نبوّت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت کے بارے میں قرآن مجید کی صرف دو چھوٹی چھوٹی آیتوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی صداقت پر ایک ناقابلِ انکار حجت کی حیثیت بھی رکھتی ہیں، یہ سورۂ مدّثر کی پہلی آیتیں ہیں، ارشاد ہوتا ہے :

"یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ o قُمْ فَاَنْذِرْ o" "اے چادر میں لپٹے ہوئے انسان! اُٹھ اور (انسانیّت کو گمراہی کے نتائج سے) باخبر کر دے!"

اِن آیات کے متعلق ایک روایت تو یہ ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم پر آغازِ وحی میں یہی آیتیں نازل ہوئیں۔ لیکن اگر مشہور روایت کیمطابق . . . اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ o کو سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات تسلیم کیا جائے تو بھی سُورۂ علق کی یہ آیات محض تمہیدی ہیں۔ کارِ نبوّت کا آغاز در اصل ان آیات سے ہوتا ہے جو "سُورۂ مُدّثر" کی ابتداء میں ہیں اور جو فترۃ الوحی (وحی کا وقفہ) کے بعد نازل ہونے والی پہلی آیات ہیں۔

"المُدثر" کی حقیقت

ان میں سے پہلی آیت میں حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تصویر "المُدثّر" کے لفظ سے کھینچی گئی ہے جو دثار کے لفظ سے بنا ہے۔ "دثار" اس بڑی چادر کو کہتے ہیں، جو انسان موسم کی سختی یا کسی اور بیرونی تکلیف سے بچنے کیلئے اپنے اصل لباس کے اوپر سے لپیٹ لیتا ہے۔ اس چادر کی خصوصیّت یہ ہوتی ہے کہ وہ بیرونی نگاہوں، خطروں اور موسم و ماحول کی سختیوں سے انسان کو بچاتی ہے اور انسان کی اصل شخصیّت اُس کی قوّت و طاقت،

اُس کی ذہانت و فطانت، اُس کی عمر و صحّت وغیرہ اُمور اُس کے اندر مخفی رہتے ہیں۔

عربی قاعدہ کی رُو سے "مُدّثر" اُس شخص کو کہا جائے گا جو دثار (بیرونی چادر) میں خوب اچھی طرح لپٹا ہوا ہو۔ اب ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کارِ نبوّت کے آغاز میں اس خطاب سے کیوں مخاطب کیا گیا۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہمیں جاہلی معاشرے کی اس حالت کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سانس لے رہے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ معاشرہ فسق و فجور، فتنہ و فساد، ظلم و تعدّی، کمزور آزاری، بے حیائی و بداخلاقی، شراب نوشی اور قتل و غارت گری اور فکر و نظر کی ہر گمراہی میں مبتلا تھا۔ ایسے بگڑے ہوئے معاشرے میں ایک صالح فطرت انسان اپنے آپ کو کتنا اجنبی محسوس کرتا ہوگا۔ بچپن میں اُس کو آوارہ بچّوں کے کھیل نہ بھاتے ہوں گے، نوجوانی میں اُس کو نوجوانوں کی دلچسپیوں سے کوئی سروکار نہ ہوگا، بڑوں کی ہوسِ جاہ و زر اور اس میں اندھے ہو کر ایک دوسرے کے خلاف سازش اور طاقت کا استعمال، پھر اُن کی عیش پرستانہ زندگی! غرض کہ اُن کی کسی بات میں بھی تو اس کے لئے کشش نہ ہوگی۔ بالکل اس طرح جیسے آج کل ہمارے ملک کے کسی دُور دراز دیہات کا رہنے والا کوئی صالح اور متقی مسلمان پیرس یا امریکہ کی بدنام زمانہ تفریح گاہوں میں یکایک پہنچ جائے۔ بیچارہ اوّل تو اپنے گوشۂ عافیّت سے نکلنا ہی پسند نہ کرے گا، تنہائی اور عزلت سے اُس کی دوستی ہوگی اور اگر گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہی ہو جائے گا تو اُس کی خواہش یہی ہوگی کہ نہ وہ کسی کو دیکھے

اور نہ کوئی اُسے دیکھ پائے، نگاہیں نیچی کئے ہوئے اپنی شخصیت کو چھپائے ہوئے، سب سے بچتے بچاتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لے گا۔

آنحضرتؐ کی سیرت قبل نبوّت

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت سے قبل چالیس سال کی زندگی جاہلی معاشرے میں بالکل اسی طرح گذاری۔ جب آپ بچے تھے تو عام بچّوں سے آپ کے ڈھنگ نرالے تھے۔ جب آپ جوانی کی ہنگامہ خیز زندگی میں داخل ہوئے تو نہ قبائلی جھگڑوں میں حصّہ لیا، نہ قریش کے دیگر محبوب مشغلوں سے آپؐ نے کوئی سروکار رکھا، نہ آپ نے کبھی راگ ورنگ کی محفلوں میں شرکت کی، نہ لوگوں نے آپ کو میلوں ٹھیلوں میں دیکھا، نہ آپؐ ناؤ نوش کی محفلوں میں شریک ہوئے، نہ کبھی طوافِ عُریاں کو گوارا کیا، نہ شرک وبت پرستی کی رسوم میں کبھی آپ نے دلچسپی لی۔

اس معاشرے میں چالیس سال زندگی گزارنے کے بعد بھی صرف گنتی کے چند آدمی آپؐ کے یارِ غار اور غمگسار تھے۔ نبوّت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہی نقشہ کتابوں میں ملتا ہے، اور جب وحی کا آغاز ہونے والا تھا تب تو آپ بالکل ہی سب سے الگ تھلگ ہو کر کافی کافی طویل مدّت کے لئے غارِ حرا میں جا بیٹھتے اور پھر سامانِ خورد ونوش ختم ہونے پر ہی مکّہ کا رُخ کرتے تھے۔ حضُور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس زندگی کی تصویر کشی اگر صرف ایک لفظ سے کرنی ہو تو بتایئے کہ کیا "المدّثر" کے لفظ سے زیادہ بہتر اور جامع کسی اور لفظ سے کی جا سکتی ہے!!

صلاحیتیں مخفی ہیں

یہ تو اس لفظ "مُدّثر" کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس لفظ میں ایک دوسری حقیقت

بھی چھپی ہوئی ہے، اور وہ یہ کہ چادر میں لپٹے ہوئے شخص کی شخصیت مخفی رہتی ہے۔ اُس کی صلاحیتوں، توانائیوں اور قوّتوں کا کوئی اندازہ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ گویا لفظ "المدّثر" اس بات کی جانب بھی اشارہ کر رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنے معاشرے میں الگ تھلگ زندگی گزار رہے ہیں۔ اُن کے اندر قوّتوں اور صلاحیتوں کا وہ خزانہ مخفی ہے، جس کا کوئی اندازہ اس جاہلی معاشرے کو نہیں ہے، جس میں آپؐ زندگی گزار رہے ہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چالیس برس کی عمر تک نہ قبائلی سردار کی حیثیت سے اُبھرے، نہ قریش کے صاحبِ دولت واقتدار فرد کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ لیکن جب آپؐ نے نبوّت کے بعد دعوتِ اسلامی کا کام شروع کیا تو دُنیا نے دیکھا کہ آپ بہترین مُبلّغ، اعلےٰ درجے کے مُعلّم و مُربّی ہونے کے ساتھ ساتھ گرد وپیش کے حالات پر گہری نظر رکھنے والے سیاستدان، فوجوں کی بہترین رہنمائی کرنے والے قائد اور ایک نظریاتی مملکت کے بہترین سربراہ بھی ہیں۔

دیکھیے اس چھوٹی سی آیت میں جو صرف دو لفظوں پر مشتمل ہے، کس طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ صرف پورے ماضی کو ایک لفظ میں بیان کر دیا گیا ہے بلکہ مستقبل کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے

لفظ "قُمْ" کی تاثیر

دوسری آیت میں اسی الگ تھلگ رہنے والی ہستی کو اچانک حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اُٹھے اور اس کا معاشرہ جن اعتقادی گمراہیوں، اخلاقی پستیوں، اور ظلم وزیادتیوں میں ڈوبا ہوا ہے، اُس کے بُرے نتائج سے لوگوں کو آگاہ کر دے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ایک شخص جو شروع ہی سے اپنے معاشرے سے کٹا ہوا ہو جس کا مزاج، جس کی افتادِ طبع، جس کی سرشت، جس کی سیرت، جس کا کردار معاشرہ سے کوئی مناسبت نہ رکھتا ہو۔ اور جو چالیس سال کی عمر تک عزلت پسند اور خاموش طبع انسان کی حیثیت میں پہچانا جاتا ہو، معاشرے کی ساری گمراہیوں کو اپنی پوری جوانی کے زمانے میں خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہا ہو، جس نے اپنے معاشرے کے خلاف کوئی لب کشائی نہ کی ہو، وہ بھلا چالیس سال کی پختہ عمر کے بعد یکایک اپنے مزاج اور اپنی سیرت کو کیسے بدل سکتا ہے۔

لیکن اللہ تعالےٰ کے لفظ "قُم" (اُٹھ) میں کیا معجزانہ طاقت بھری ہوتی تھی کہ جونہی آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو حکم ملا۔۔ قُمْ فَاَنْذِرْ! اُٹھ اور غلط روی کے بُرے نتائج سے آگاہ کردے! — فوراً ہی آپ نے خاموشی کی چادر اُتار پھینکی اور دعوت و تبلیغ کا کام اس زور سے کرنے لگے کہ جس کی مثال دعوت و تبلیغ کی تاریخ میں ملنی محال ہے۔ حتیٰ کہ خود اللہ تعالےٰ نے بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو حدِ اعتدال سے زیادہ مشقت برداشت کرنے سے منع فرمایا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ	تو شاید آپ رنج کے مارے
عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ	اُن کے پیچھے اپنی جان ہی دے
يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ	ڈالیں گے۔ اگر وہ اس پیغام
اَسَفًا ○	پر ایمان نہ لائے!

ہمیں دنیا کی تاریخ میں اس کی تو بہت مثالیں ملتی ہیں کہ ایک شخص ابتداء ہی سے اصلاحِ معاشرہ کا کام کر رہا ہو۔ چھوٹی، بڑی اصلاحی تحریکوں میں حصہ لے رہا ہو، اور پھر اُس نے آگے چل کر کوئی بڑا کارنامہ کر دکھایا ہو،

لیکن اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی شخص جوانی تو خاموشی میں بتا دے، لیکن اُدھیڑ عمر میں پہنچ کر اپنے معاشرے کے خلاف بغاوت کا اعلان کر ڈالے، اُس سے جنگ آزما ہو جائے اور بالآخر اُس کو بدل کر رکھ دے۔

ناقابلِ انکار دلیلِ نبوّت

لہٰذا اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے چالیس سال کی عمر کے بعد جس مہم کا آغاز کیا وہ آپ کی اپنی ایجاد کردہ کوئی تحریک نہ تھی بلکہ وہ اللہ ربّ العالمین ہی کی دعوت تھی، جس کو آپؐ نے اسی کے حکم سے جاری فرمایا تھا۔ لفظِ "قُم" کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو حکم دیا گیا تھا اُس سے قبل آپؐ کی زندگی کچھ اور تھی۔ لیکن اس لفظ کی قوت حاصل ہونے کے بعد آپؐ کی زندگی بالکل ہی بدل کر رہ گئی۔

معاملے کو اگر اِس پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیاتِ نبوّت کی صداقت کی اُس دلیل کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں، جس کا ذکر نسبتاً زیادہ تفصیل سے دیگر آیات میں کیا گیا ہے مثلاً: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (سورۃ یونس ۱۶) "میں تمہارے درمیان ایک (اچھی خاصی) عمر گذار چکا ہوں، تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو!" — دوسری جگہ ارشاد ہے: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ۔ (سورۃ شوریٰ: ۵۲): "(اے نبیؐ) تم جانتے بھی نہ تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے، اور ایمان کسے کہتے ہیں۔ لیکن یہ تو ہم ہیں کہ ہم نے اُس کو نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم جس کو چاہتے ہیں، ہدایت دیتے ہیں!"

اِنذار اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی

گذشتہ صفحات میں "سورۃ مدثر" کی پہلی دو آیتوں کی روشنی میں ہم نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صالح فطرت کی بنا پر جاہلی معاشرے سے بالکل بیزار اور اُس کی انفرادی و اجتماعی، لایعنی یا مفسدانہ، ظالمانہ یا گمراہانہ سرگرمیوں سے قطعاً لاتعلق تھے۔

اس مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوّت سے قبل اگرچہ عُزلت اور گوشہ نشینی کی زندگی کو پسند فرماتے تھے۔ لیکن جونہی آپؐ کو "قُمْ فَاَنْذِرْ" کا حکم ملا، آپ معاشرے کی ہر گمراہی اور بدکرداری کے خلاف سرگرمِ عمل ہو گئے۔

اِن آیاتِ کریمہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از نبوّت چالیس سالہ زندگی میں وہ قوّتیں اور صلاحیّتیں مخفی رہیں جن کا ظہور بعد از نبوّت ہونے والا تھا۔

ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو گئی تھی کہ حُضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبل از نبوّت زندگی اور بعد از نبوّت زندگی میں جو عظیم الشّان فرق پایا جاتا ہے، اُس کی کوئی توجیہ اس کے سوا ممکن نہیں کہ بعد از نبوّت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ روشنی اور قوّت حاصل ہو گئی تھی، جس کو ہم وحیِ الٰہی کے لفظ سے تعبیر

کرتے ہیں۔

انذار کا مفہوم

آج اپنی ہدایت و رہنمائی کے لئے ہم یہ بات معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایسی بگڑی ہوئی سوسائٹی اور ایسے فاسد معاشرے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح کا نقطۂ آغاز کس چیز کو بنایا؟ اس سلسلے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ کسی صحیح تعمیر کا تصوّر بھی اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ موجود الوقت غلط تعمیر کی بنیادوں کو نہ ڈھا دیا جائے۔ چنانچہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کام "انذار" تھا، یعنی لوگوں کو اِن خطرات سے آگاہ کرنا، جن سے وہ اپنے غلط عقائد اور غلط اعمال کی وجہ سے دوچار ہونے والے تھے تاکہ وہ اس غلط بنیادوں پر تعمیر ہونے والے نظامِ اجتماعی کی عمارت کو منہدم کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریب ترین اہلِ خاندان کو جمع کیا تو مستقبل کے اصل خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ وَلَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءًا وَاِنَّھَا لَلْجَنَّۃُ اَبَدًا اَوِ النَّارُ اَبَدًا وَاَنْتُمْ لَاَوَّلُ مَنْ اُنْذِرَ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ ؕ (ترجمہ): "خدا کی قسم تم ایک دن مر جاؤ گے، جس طرح سو جاتے ہو۔ اور پھر تم سے تمہارے اعمال کا ضرور حساب لیا جائے گا۔ تمہیں بدلہ دیا جائے گا بُرائی کا بُرائی سے اور اچھائی کا اچھائی سے، اور پھر یا ہمیشہ کی جنّت ہے یا ہمیشہ کی دوزخ اور تم پہلے وہ لوگ ہو جن کو ایک سخت عذاب آنے سے قبل خبردار کر دیا گیا ہے!"

اسی طرح آپؐ نے اپنے قبیلے کو بلکہ تمام اہلِ مکّہ کو کوہِ صفا کے دامن میں جمع کیا اور پھر یہ کہہ کر گفتگو کا آغاز فرمایا: اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَانُ ؕ

دیں کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں!) آپ نے اُنہیں بتایا کہ انجام سے بے خبر، جوابدہی سے بے نیاز، دُنیا پرستی اور خدا فراموشی کی جس زندگی میں تم مبتلا ہو وہ محض فریب ہے اور یہ حیاتِ مستعار جب واپس لی جائے گی، تو تم کو ایک ایک چیز کا حساب دینا ہوگا۔

یہ کہنے کو منفی کام تھا، لیکن حقیقتاً وہ بھی تعمیرِ معاشرہ کے لئے ایک مثبت بُنیاد فراہم کرتا تھا، اور وہ یہ کہ انسان غیر مسئول نہیں بلکہ مسئول ہے، آزاد نہیں بلکہ بندہ ہے۔ اس کے لئے فنا نہیں بلکہ بقا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا مفہوم

پھر انذار کے اس کام کے ساتھ ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمّہ جو مثبت کام سپرد کیا گیا تھا، وہ اسی سورت کی تیسری آیت میں بیان کیا گیا ہے: "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" (اور صرف اپنے ربّ ہی کی بڑائی کرو!) اِس چھوٹی سی آیت میں وسیع مطالب پنہاں ہیں، لیکن ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ: "سَبِّحْ" کے معنی محض زبان سے سُبحان اللہ کہنا ہے اور "کَبِّرْ" کے معنی محض زبان سے اللہ اکبر کہنا ہیں۔ حالانکہ حقیقتاً ان الفاظ کا مفہوم صرف وہ نہیں ہے جو ہم نے سمجھا ہے، دیگر الفاظ کو چھوڑیئے۔ اس وقت صرف لفظ کَبِّرْ کو لے لیجئے، اس لفظ کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ آدمی زبان سے بھی صرف اللہ کی بڑائی کا اعلان کرے، قلب میں بھی صرف اللہ کی بڑائی کا یقین رکھے، دماغ سے بھی غیر اللہ کی بڑائی خارج کردے اور وہ تمام قوتیں اور طاقتیں، بُت اور انسان موہوم و موجود اشیاء جو بڑائی میں اللہ تعالےٰ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی ہوں یا جن کے بارے میں اس قسم کا دعویٰ کیا جاتا ہو، ان سب کے مقابلے میں کلمہ "اللہ اکبر" ایک اعلانِ

جنگ ہے اور شعور کے ساتھ جو شخص یہ اعلان کرتا ہے، وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا، جب تک کہ زمین پر بھی اللہ کی بڑائی اس طرح قائم نہ کر دکھائے جیسی آسمانوں میں اس کی بڑائی ہے۔ بالفاظِ دیگر جب تک انسان دائرہ اختیار میں بھی اُسی ربّ کی بندگی کو نہ قبول کرلے، جس ربّ کی بندگی دائرہ جبر میں وہ کرتا ہی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ: "رَبَّكَ فَكَبِّرْ" کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی فرمانروائی، بالادستی، اقتدارِ اعلیٰ اور عظمت کو قائم کیا جائے اور بڑائی کے تمام جھوٹے مدعیان چاہے وہ آدمی کا اپنا نفس ہو، چاہے وہ شیطان ہو، چاہے جِن ہو، چاہے بشر ہو، چاہے مرئی یا غیر مرئی مخلوق ہو، سب کی جھوٹی برائی کا قلع قمع کر دیا جائے۔

یہ وہ عظیم الشان کام تھا جو اس جاہلی معاشرے میں تن تنہا کسی ساز و سامان اور مادّی سہارے کے بغیر حُضور صلّی اللہ علیہ وسلم کو انجام دینا تھا اور آپ نے ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں جزیرہ نمائے عرب کے اندر اللہ کی بڑائی عملاً قائم کر دکھائی۔ نیز اللہ کے سپاہیوں کی ایسی جانباز فوج تیار کر دی جو اس مقصد کو لے کر اس وقت کی پوری متمدّن دُنیا میں پھیل جانے کی اور اس پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

کرنے کا کام

قرآن مجید کی روشنی میں سیرتِ پاک کے اس مطالعے سے جو سبق ہم کو حاصل ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر مومن کے کرنے کا کام یہی ہے، یعنی دلوں میں فکرِ آخرت پیدا کی جائے، دُنیا کی بے ثباتی کا نقش بٹھایا جائے، آخرت کی کامیابی کو اصل مطلوب بنایا جائے، اور ربّ العزت کے سامنے جوابدہی کا یقین رکھنے والوں کی منظم کوشش

کے ذریعے اللہ کے کلمہ کو سب کلموں سے بلند کر دکھایا جائے اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا جیتا جاگتا شعور پیدا کیا جائے اور اللہ کی عظمت کے مقابلے میں ہر عظمت کو پیوندِ خاک کر دیا جائے۔

دورِ حاضر میں یہی کام ان سب لوگوں کو کرنا ہے جو مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے مقابلے میں ہمارے لئے یہ کام کرنا اس لحاظ سے تو آسان تر ہے کہ آج خدا کے فضل سے دُنیا میں کروڑوں مسلمان بستے ہیں۔ جن کے پاس ہر قسم کے وسائل اور ہر طرح کا ساز و سامان موجود ہے۔ یہ سارے مسلمان اگر مل کر اللہ جل جلالہ کی بڑائی کو قائم کرنے کا عزم کر لیں، تو باطل ایک منٹ کے لئے بھی اُن کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا۔ بلکہ سارے مسلمان تو بڑی بات ہیں، اگر صرف دس فیصد مسلمان بھی عزم و ہمّت اور اخلاص کے ساتھ اس مقصد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں تو بڑائی کے تمام جھوٹے مدّعیوں کو بالآخر اللہ کی بڑائی کے سامنے سر جھکانا پڑ جائے۔

لیکن ایک لحاظ سے یہ کام آج کے زمانے میں زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں اس کام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بیگانے نہیں بلکہ اپنے لوگ ہیں، دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں، یہی سب سے بڑا روڑا بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے اس دعوے پر نہ حیرت کیجئے اور نہ غصہ بلکہ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ کیا آج:

- مسلمانوں کی بھاری اکثریت اس مقصد کو سرے سے فراموش نہیں کر چکی ہے؟

- کیا مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے اس مقصد کے حصول کے بجائے بعض چھوٹی چھوٹی رسموں کے پورا کر دینے ہی کو اصل دین نہیں سمجھ لیا ہے؟
- کیا مسلمانوں کی بھاری اکثریت آج دنیا پرستی میں مبتلا ہو کر آخرت کو فراموش نہیں کر بیٹھی ہے؟
- کیا ہم میں ہر شخص نے عملاً یا تو اپنے نفس کو، یا خاندان اور قبیلہ کو، یا قوم اور وطن کو بڑائی کا وہ مقام نہیں دے رکھا ہے جو صرف اللہ ربُّ العزّت کے لئے خاص ہے؟

ان حالات میں اگر کوئی اللہ کا بندہ اس مقصد کے لئے اُٹھتا ہے کہ دُنیا کے لوگوں کو غفلت سے چونکا کر، دنیا پرستی سے ہٹا کر بندگی رب کی طرف بلائے اور اللہ کی بڑائی کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ کرے تو اکثر خود مسلمان ہی اُس کے خلاف سب سے زیادہ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور جب تک اُس کی آواز ختم نہ ہو جائے بیچارے مسلمانوں کو اس وقت تک چین ہی نہیں آتا۔ اس صورتِ حال کا علاج کیا ہے؟ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس کام پر مامور کیا گیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہونے کے لحاظ سے جس کام کی ذمّہ داری اب ہم پر ہے!! (کیونکہ اب اور کوئی نبی نہیں آنے والا ہے۔) اس کام کو اب کیسے کیا جائے، اس سوال کا جواب بھی سورۂ مدّثر کے ابتداء ہی میں موجود ہے۔ اور اللہ ربُّ العزّت نے ہمارے کام کرنے کا واضح طریق کار بھی متعیّن فرما دیا ہے۔ اس طریقِ کار کی وضاحت ہی اس کتاب کا مقصد ہے۔

لائحہ عمل

سُورۃ مدّثر کی ابتدائی سات آیات میں اللہ تعالےٰ نے اوّلاً اس مہم کو بیان فرمایا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے توسّط سے آپ کی اُمّت کے حوالے کی گئی تھی یعنی آخرت کی جواب دہی کی اساس پر اللہ تعالےٰ کی بڑائی کا نظام قائم کرنا۔

پھر اس مہم کو سر کرنے کے لئے لائحہ عمل اور طریقِ کار بھی بیان فرما دیا۔ بعد نبوّت آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی لائحہ عمل اور طریق کار کی تفسیر و تفصیل ہے۔ آج ہم اسی لائحہ عمل کو سمجھنے کی کوشش کریں گے، تاکہ ایک طرف سیرتِ نبوی کے ساتھ ہمارا تعلق مستحکم ہو۔ دوسری طرف ہم خود بھی اس لائحہ عمل کے مطابق کام کرنے کا عزم کریں۔

تطہیر

اس لائحہ عمل کا پہلا جزو وَ ثِیَابَکَ فَطَهِّرْ ہے، جس کے لفظی معنی ہیں: "اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو!" اس کی تفسیر میں مفسّرین کے بہت سے اقوال منقول ہیں چونکہ ان اقوال میں باہم کوئی تضاد نہیں، اس لئے وہ سب مفہوم بیک وقت بھی مراد ہو سکتے ہیں ـــــ !!

ثیاب (کپڑوں) کے معنی کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس

سے مراد نفس یا دل ہے۔ یعنی اپنے دل کو پاک رکھو۔ دل کو پاک رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جس مہم کو سر کرنے کے لئے تم جا رہے ہو، اس میں آخرت کی طلب اور اللہ کی رضا کے سوا اور کوئی مقصد تمہارے دل کو گندہ کرنے کے لئے موجود نہ ہو۔ نہ شہرت و ناموری کی خواہش، نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پرواہ، نہ اقتدار کی طلب، اور نہ کچھ اور، صرف اور صرف رضائے الٰہی کا حصُول تمہارا مقصود ہونا چاہیئے۔

ثیاب کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد عمل و اخلاق ہیں، یعنی تمہارے اخلاق پاکیزہ ہونے چاہئیں، نہ تمہارے قول و عمل میں تضاد ہو، نہ تمہاری زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف پہنچے، نہ تمہاری سیرت و کردار میں کوئی چیز ناپسندیدہ اور گندی ہو۔

ثیاب کے بارے میں تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد کپڑے ہی ہیں۔ لیکن ان کو پاک رکھنے سے مراد یہ ہے کہ یہ حلال ذریعے سے حاصل کردہ ہوں۔ ظاہر ہے جب کپڑے جو محض جسم سے لگے رہتے ہیں، اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ حلال ذریعہ سے حاصل کئے جائیں، تو پھر غذا جو جسم و رُوح کا حصّہ بنتی ہے، اُس کو تو لازماً حلال و طیّب ہونا چاہیئے۔

ان تمام اقوال میں مشترک بات یہ ہے کہ انسان کے ساتھ جو چیز بھی کپڑوں کی طرح چمٹی رہتی ہے، اُسے ثیاب کہا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے اللہ تعالےٰ نے بیوی کو شوہر کے لئے، اور شوہر کو بیوی کے لئے لباس قرار دیا ہے۔

اس سے یہ مفہوم بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تمہارے ساتھی اور رفیق پاکیزہ اخلاق کے مالک ہوں اور ان میں سے جو تم سے جتنا زیادہ قریب

ہو اس کا اخلاق اتنا ہی زیادہ پاکیزہ ہونا چاہیئے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ کی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی جواب دہی اور اللہ کی بڑائی کی طرف بلانے والے کا نفس گندے جذبات سے دل بُری نیتوں سے اور اخلاق ناپاک عادتوں سے پاک ہونے چاہئیں، یہی نہیں بلکہ اس کام میں اس کے ساتھی بھی اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے مالک ہونے چاہئیں — یہ لائحہ عمل کا پہلا جزو ہے

شرک سے اجتناب

اس کے بعد ارشاد ہے: وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اور گندگی سے قطع تعلق کرلے۔ اس آیت میں "گندگی" کے بارے میں اکثر مفسرین کا قول یہی ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ یعنی شرک سے بالکل دور رہو، اس سے تمہارا کوئی واسطہ اور تعلق نہ ہونا چاہیئے۔

یہ آیت دراصل پہلی آیت کی تکمیل کرتی ہے، یعنی پہلی آیت میں طہارت کا مثبت حکم دیا گیا ہے تو اِس آیت میں اُس اصل گندگی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، جو عقائد و اعمال میں جہاں بھی پائی جائے اس کو بالکل نجس کر کے رکھ دیتی ہے، یعنی شرک — اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص اللہ کی بڑائی قائم کرنے چلا ہو، وہ شرک سے قطعاً دور رہے اس کے ساتھ کسی شکل میں مصالحت نہ کرے۔

لہٰذا خواہ کُھلی کُھلی مشرکانہ سوسائٹی ہو یا ایسے مسلمانوں کا وہ معاشرہ جن میں جہالت کے باعث مشرکانہ طور طریقے پھیل گئے ہوں جو شخص اللہ کی بڑائی کو قائم کرنا چاہتا ہوں، اسے بہرحال کسی بھی مصلحت کی خاطر شرک سے ادنیٰ تعلق اور واسطہ بھی نہ رکھنا چاہیئے۔ یہ لائحہ عمل کا دوسرا جزو ہے، یا پہلے جزو کی تکمیل ہے۔

خدمتِ خلق

اس کے بعد ارشاد ہے: وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ اس آیت کے بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں، مشہور قول یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو مگر اس کے بدلے میں زیادہ لینے کی نیت سے نہیں۔ اگر یہ قول لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی بڑائی قائم کرنے کی مہم کو جو شخص لے کر اٹھا اُس کو خدمتِ خلق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ لیکن اس کی غرض محض اللہ کی رضا اور اسکی خوشنودی کا حصول ہونا چاہیئے۔ شہرت یا ناموری، مقبولیت یا عوامی تائید کا حصول یا کوئی دیگر مادّی فائدہ پیشِ نظر نہ ہونا چاہیئے۔

مشہور مفسّر مجاہد نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ بھلائی کام خواہ کتنا ہی کر ڈالو مگر اُسے زیادہ نہ سمجھو اور نہ زیادہ سمجھ کر بھلائی کرنے سے رُک نہ جاؤ۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی بڑائی کے علمبردار کو زیادہ سے زیادہ بھلائی کرنے کے بعد بھی اس کو بہت نہ سمجھنا چاہیئے، نہ اسی پر بس کر دینا چاہیئے بلکہ اس راہ میں اپنا جان و مال سب کچھ کھپا دینے کے بعد بھی یہی سمجھنا چاہیئے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ یہ لائحہ عمل کا تیسرا جزو ہے۔

آخر میں لائحہ عمل کے چوتھے جُز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہدایت کی گئی:- وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ "یعنی اپنے ربّ ہی کے لئے صبر کرو!"

صبر

صبر کے اصل معنی روک رکھنے کے ہیں۔ یہاں صبر کا مطلب یہ ہے کہ اس لائحہ عمل پر کام کرتے ہوئے نہ تو جلد بازی دکھاؤ کہ فوری نتائج کے حصول کی توقع پر لائحہ عمل کے بعض اجزاء پر عمل نہ کر دیا اُن پر عمل کرنے میں کوئی کمی کر دو نہ مشکلات سے گھبرا

کر اس مقصد کو یا اس لائحہ عمل کے کسی جُز کو چھوڑ بیٹھو، نہ کسی لالچ کے باعث اپنے مقصد سے ہٹو۔ بلکہ ہر حال میں ثابت قدم رہو۔ اور یہ ثابت قدمی محض اپنے رب کے لئے ہونی چاہیئے۔

یہی نہیں بلکہ اس راستے میں جو صبر درکار ہے وہ محض اللہ تعالےٰ پر ایمان ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ "اور صبر کر اور نہیں تیرا صبر کرنا مگر اللہ کے ذریعے!"

لائحہ عمل کے اجزاء

بندگانِ خدا کو دُنیا پرستی سے نکال کر آخرت طلبی کی راہ پر لگانے اور غیر اللہ کی بڑائی ختم کرکے اللہ کی بڑائی قائم کرنے کے نصبُ العین کا حصول جس لائحہ عمل پر موقوف ہے اس کے اجزاء چار ہیں:

۱ - تطہیرِ قلب و نفس اور تطہیرِ رفقاء و انصار
۲ - شرک سے کلّی اجتناب (یہ اگرچہ پہلے جُز ہی کا حصہ ہے لیکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے!)
۳ - کسی مادّی بدلے کی توقع کے بغیر خدمتِ خلق یا مسلسل جدّوجہد۔
۴ - محض اللہ تعالےٰ کی خاطر صبر و ثبات۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ کا آپ تفصیلی مطالعہ کریں گے تو لائحہ عمل کے ان چاروں اجزاء پر آنحضرتؐ کے عمل پیرا ہونے کی تفصیلی کیفیت معلوم ہوگی اور ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے ماحول میں اس نصبُ العین کے حصول کے لئے اللہ تعالےٰ کے مقرّر کردہ لائحہ عمل کو اختیار کرنے کی صورتیں معلوم کرسکے گا۔

اِنذار

دعوت کے ابتدائی دَور میں

سُورۂ مدّثر کی ابتدائی آیات کی روشنی میں ہم معلوم کرچکے ہیں کہ نبوّت کے بالکل ابتدائی دَور میں اللہ تبارک و تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کام کے سلسلہ میں کیا ہدایات دی تھیں۔ ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان ہدایات کی سختی کے ساتھ پابندی کی لہٰذا آپؐ کی سیرتِ طیّبہ کا مطالعہ ہم انہی قرآنی ہدایات کی روشنی میں باآسانی کرسکتے ہیں۔

اِنذار اور تبشیر

نبوّت کے ابتدائی دَور میں آنحضرت اللہ علیہ وسلم کا سب سے مقدّم کام "اِنذار" تھا۔ اِنذار کے معنی ہیں: "آنے والے خطرہ سے باخبر کردینا!" اِنذار کے اندر "تبشیر" یعنی اچھے مستقبل کی خوشخبری دینا خود بخود شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کو اللہ تعالےٰ نے مُبشِّر اور مُنذِر دونوں صفات کے ساتھ یاد فرمایا ہے اور موقعہ کی مناسبت سے کہیں دونوں صفات کا ذکر ہے، کہیں کسی ایک صفت کا، پھر کہیں ایک صفت کو مقدّم کیا گیا ہے تو کہیں دوسری صفت کو۔

انذار کے باب میں انبیاء کی سُنّت

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے جب رسالت کا فرض ادا کرنا شروع کیا تو آپؐ کو صرف "انذار" کا حکم دیا گیا تھا اس کی وجہ جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ اگر کوئی معاشرہ اپنے حال پر خوش اور مطمئن ہو اور مستقبل کے بارے میں قطعاً فکر مند نہ ہو تو وہ اپنے حال کو بدلنے پر بھلا کب راضی ہو سکتا ہے۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام کا اصل اور ابتدائی کام ہمیشہ "اِنذار" ہی کا کام ہوتا ہے۔ وہ نہایت شدید اور چونکا دینے والے انداز اور جھنجھوڑ کر رکھ دینے والی عبارتوں سے ان "حال مست" اور "مال مست" افراد کو مستقبل کی فکر کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

انذار کی حکمت

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے معاشرہ کے ایسے افراد جو ذاتی مفادات کے تحفظ سے بالاتر ہوتے ہیں، جو تقلید آباء کے بجائے خود اپنی عقل و فکر سے بھی کام لیتے ہیں اور جو شعور اور احساس کی نعمت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے انذار سے بیدار ہو جاتے ہیں اور معاشرہ کو تباہی سے بچانے کے لئے غلط اور خطرناک بنیادوں کو ڈھانے اور صحیح بنیادوں پر اس کی تعمیر کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی باحوصلہ لوگ آگے بڑھتے ہیں اور ہر قسم کی آزمائشوں اور تکلیفوں کو ہنستے مسکراتے برداشت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جاہلی معاشرہ مکمل طور پر ایک اسلامی معاشرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے

ابتدائی دور میں دعوت کا طریقہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء میں کُھلّم کُھلا دعوت

پہنچانے کا حکم نہ تھا۔ جیسا کہ آیت: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ۔ (کھلے پکارے کہہ دیجئے وہ بات جس کا آپؐ کو حکم دیا جا رہا ہے) سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس آیت کے بارے میں اکثر مفسّرین کا اتفاق ہے کہ وہ نبوت کے ابتدائی تین سال کے بعد نازل ہوئی تھی اور اسی آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام دعوت کا آغاز فرمایا۔ ابتدائی دور میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ پر ایمان لانے والے اصحاب انفرادی ملاقاتوں اور شخصی روابط کے ذریعہ اس دعوت کو پھیلانے کی کوشش کرتے رہے۔ تین سال کی اس مدت میں ابنِ ہشام کے بیان کے مطابق جو لوگ ایمان لائے، اور اللہ کی بڑائی کو قائم کرنے کے لئے جنہوں نے ہر قربانی کا عزم کر لیا، ان کی تعداد پچاس سے زائد ہو چکی تھی۔ ان ابتدائی ایمان لانے والوں میں قریش کی سب سے مالدار خاتون حضرت خدیجہؓ، بنی ہاشم کے سردار جناب ابو طالب کے بیٹے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ حضرت علیؓ، قریش کے سب سے سنجیدہ، باوقار اور صاحبِ کردار تاجر حضرت ابو بکرؓ (جو قبائل عرب کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات رکھتے تھے) فاتح ایران حضرت سعد ابن ابی وقاص، فاتح شام حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح، اور فقیہہ الاُمّت حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے ممتاز اصحاب شامل ہیں۔

اس دَور میں حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ پر ایمان لانے والوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ ایسے افراد کو منتخب کیا جن سے اُن کے شخصی روابط تھے۔ ان کو آخرت فراموشی اور دُنیا پرستی کے خوفناک نتائج سے آگاہ کیا، شرک کو چھوڑ کر توحید پر ایمان لانے کی دعوت دی۔

تین سال کی اس مدّت میں قریش کو اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا علم ہو چکا تھا لیکن وہ عام طور پر حضورؐ کی دعوت کو اپنے لئے کوئی خطرہ تصوّر نہ کرتے تھے۔ چنانچہ نوجوانوں کو اس نئے دین کے مطابق عبادت کرتے ہوئے اگر کوئی بڑا بوڑھا دیکھ لیتا تو یا تو اُن کی کچھ حوصلہ افزائی کر دیتا یا کچھ ڈانٹ ڈپٹ دیتا تھا!

ابتدائی دَور میں قرآنی سُورتوں کا عمومی انداز

قرآن مجید کی جو سُورتیں اس زمانے میں نازل ہوئیں مثلاً سُورۂ مدثر، سُورۂ مزمل، سُورۂ علق، یا سُورۂ ضحیٰ وغیرہ ان میں یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین اور تسلّی دی گئی تھی یا اس عظیم الشان کام کو انجام دینے کے لئے ضروری ہدایات دی گئی تھیں اور یا پھر ان میں "انذار" کی شان نمایاں تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حوصلہ افزائی کے لئے قرآن مجید کی جو سُورتیں اس زمانے میں اتریں اُن کے بارے میں ان شاء اللہ ایک مستقل عنوان کے تحت بات ہوگی۔ اس وقت ہم سُورۂ علق کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھی اس جاہلی معاشرے کے منتخب افراد کو گمراہی سے نکالنے اور راہِ ہدایت پر لانے کے لئے چونکانے اور بیدار کرنے کا کیا انداز اختیار کیا کرتے تھے۔

"پڑھ اپنے ربّ کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون سے انسان کی تخلیق کی، پڑھ اور تیرا ربّ محترم اور مہربان ربّ تو وہ ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہ جانتا تھا!" — "ہرگز نہیں (جاہلیت

کا طریقہ اُس ربّ کا پسندیدہ طریقہ نہیں بلکہ) واقعہ یہ ہے کہ انسان (خود) سرکشی کرتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز پاتا ہے (حالانکہ) واقعہ یہ ہے کہ تیرے ربّ ہی کی طرف پلٹنا ہوگا!"

"کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندہ کو منع کرتا جب وہ (بندگی کے لئے) نماز پڑھتا ہے۔ (اے مخاطب) تیرا کیا خیال ہے، اگر یہ بندہ ہدایت پہ ہوا یا وہ پرہیزگاری اختیار کرنے کا داعی ہوا (ہاں) تمہارا کیا خیال ہے (کہ پھر بھی) اگر یہ جھٹلائے اور مُنہ موڑ لے (تو اس شخص کا انجام کیا ہوگا!")

"کیا اسے یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ (سب کچھ) دیکھ رہا ہے۔ ہرگز نہیں (اُس کی یہ شرارت جہالت کے باعث نہیں!) اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچیں گے (ہاں اسی پیشانی (کے بالوں کو) جو جھوٹی اور گنہ گار ہے، وہ بلا لے اپنے حامیوں کے ٹولے کو، ہم بلائیں گے عذاب کے فرشتوں کو!"

"ہرگز نہیں (وہ بچ کر نہیں جا سکتا) تم اس کے پیچھے نہ چلو اور سجدہ ریز ہو کر اپنے ربّ کا قرب حاصل کر دو!"

دیکھئے! اِن آیاتِ مبارکہ میں انسانوں کی سرکشی کے بنیادی سبب (یعنی بظاہر بے نیاز ہونا!) کو بیان کرنے کے بعد کس طرح ایسے مغرور اور متکبر انسان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جو دوسرے بندوں کو بھی اپنے ربّ کی بندگی سے روکتا ہے اور نیکی اور تقویٰ کی دعوت سننے تک کا روادار نہیں ہے۔ پھر ایسے شخص کے انجام بد سے باخبر کرنے کے بعد اس سے دُور

رہنے اور اپنے رب سے قریب تر ہو جانے کی ہدایت کتنے مؤثر انداز میں دی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے "انذار" کے اسی اسلوب کو ابتدائی برسوں میں اختیار کر رکھا تھا۔ اسی اسلوب سے متاثر ہو کر با صلاحیت، اور حوصلہ مند نوجوانوں نے اس دعوت کو قبول کیا تھا۔

اِنذار کے اوّلین مخاطب

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق تین سال تک انفرادی تعلق اور شخصی رابطے کے ذریعہ دعوت پہنچانے کا کام انجام دیا۔ اس زمانے میں حضورؐ کی دعوت پر "انذار" کا رنگ غالب تھا۔ اس دور کے اختتام سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا۔

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۔	تمہارے خاندان میں جو تم سے جتنے زیادہ قریب ہیں، ان کو آنے والے خطرے سے باخبر کرو۔

انذار ہیں صداقت کی کسوٹی

انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچّے پیروؤں اور اصلاح کے جھوٹے علم برداروں کے درمیان فرق کرنے والی جو بہت سی نشانیاں ہیں، اُن میں سے ایک بڑی نشانی یہ ہے کہ حضرات انبیاء اور ان کے طریقے پر چلنے والے بندگانِ خدا جس برائی سے منع کرتے ہیں اس سے خود دُور رہتے ہیں اور جو شخص ان کو جتنا زیادہ پیارا ہوتا ہے، اس کو بُرائی سے بچانے کے لئے فکرمند ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ باہر تو برائی کے خلاف محاذ قائم ہو

اور نیکی کا پرچار کیا جا رہا ہو اور گھر کے قریب ترین لوگوں کو اُس بُرائی سے بچانے کی کوئی فکر ہی نہ ہو۔

انذار اقربین کی چند مثالیں

یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت میں ابتداء ہی سے اپنے قریب ترین لوگوں پر زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالٰے کی اس ہدایت کے بعد کہ "اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو متنبہ کرو"۔ آپ نے خاص طور پر اپنے رشتہ داروں کی طرف توجہ دی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس سلسلہ میں اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو مختلف دعوتوں میں بلایا۔ ایک دعوت میں آپ نے صرف عبدالمطلب کے گھرانے کے ۴۰ افراد کو مدعو کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

یا بنی عبدالمطلب لو اخبرتکم ان بسفح ھذا الجبل خیلا اکنتم مصدقی؟ قالوا نعم! قال فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید۔"

"اے عبدالمطلب کے اہل خاندان! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں سواروں کا ایک دستہ (تمہاری گھات میں) ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ سب نے بالاتفاق جواب دیا "ضرور!"۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک شدید عذاب آنے سے قبل باخبر کرنا چاہتا ہوں!"۔

اسی طرح آپ نے ایک بار بالخصوص اپنے اہل خاندان کی دعوت کی اور کھانے کے بعد خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ان الرائد لا یکذب اھلہ، واللہ لو کذبت

الناس جمیعًا ما کذبتکم ولو غررت الناس جمیعًا ما غررتکم واللہ لتموتن کما تنامون ولتبعثن کما تستیقظون وتجزون بالاحسان احسانا وبالسوء سوءً وانھا لالجنۃ ابدًا او النار ابدًا۔ وانکم لاول من انذر بین یدی عذاب شدید۔

"رہنما قافلے کے لئے اگلی منزل کی بابت خبر لانے والا خود اپنے خاندان والوں کو کبھی جھوٹی رپورٹ نہیں دیتا۔ خدا کی قسم اگر میں سب دنیا والوں سے جھوٹ بولتا تب بھی تم سے تو جھوٹ نہ بولتا، اور اگر میں ساری دنیا کو دھوکا دیتا جب بھی تم کو تو دھوکا نہ دیتا۔ خدا کی قسم تم ایک دن مر جاؤ گے، جیسے سو جاتے ہو، پھر تم کو اٹھایا جائے گا، جیسے کہ تم جاگ جاتے ہو اور تم کو اچھے کاموں کا اچھا بدلہ اور بُرے کاموں کا بُرا بدلہ مل کر رہے گا۔ اور پھر یا ہمیشہ ہمیش کی جنّت ہو گی اور یا ابدالآباد کے لئے جہنم۔ (یاد رکھو!) تم کو آنے والے شدید عذاب سے قبل سب سے پہلے باخبر کیا جا رہا ہے!"

ایک بار آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کے ایک ایک گھرانے کو نام لے لے کر پکارا اور اس طرح مکّہ کا سب سے بڑا اجتماع طلب کر کے اُن کو آنے والے خوفناک لمحات سے آگاہ کیا۔

فریضۂ انذار کی ادائیگی کا اہتمام

قرآن مجید شہادت دیتا ہے کہ اس زمانے میں آپ اپنی قوم

اور اہل خاندان کے بارے میں انتہائی فکر مند تھے اور ان کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے دن رات زبردست محنت اور مشقت کرتے تھے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝

"تو شاید آپ رنج کی وجہ سے اپنی جان ان کے پیچھے دے دیں گے، اگر وہ اس حقیقت پر ایمان نہ لائے!"

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال کے ذریعہ اپنے اضطراب کو واضح فرمایا ہے کہ تم پروانوں کی طرح آگ کے شعلوں میں گرنا چاہتے ہو اور میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر اس آگ سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

علانیہ دعوت کی تیاری

انفرادی دعوت کے اس دور میں علانیہ دعوت کی تیاری کے لئے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والے اصحاب کو قیام اللیل کا حکم دیا گیا۔ تاکہ مناجاتِ شب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو۔ نفس کو ایمان وشعور کے تابع بنایا جائے اور قرآن مجید کے فہم و تدبر کیلئے اس کو رات کی خاموشیوں میں ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے۔

چنانچہ سورۂ مزمل میں آنحضرت صلی علیہ وسلم بلکہ آپ کے واسطے سے در اصل تمام داعیانِ حق کو کہا گیا ہے کہ وہ لوگ جو اس عظیم الشان دعوت کے علم بردار ہوں، اُن کے لئے چادر تان کر سوجانا کسی طرح روا نہیں ہے۔ ان کو تو شب بیداری کے آداب سیکھنا چاہئیں۔ اور رات کا بیشتر حصہ اپنے ربّ کے سامنے کھڑے ہو کر تلاوتِ آیات اور مناجات میں بسر کرنا چاہیے، تاکہ وہ اس قولِ ثقیل یعنی اس عظیم ذمہ داری کے بوجھ

کو اٹھا سکیں۔ جو دعوتِ حق کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ڈالی ہے۔

قیام اللیل

رات کا اٹھنا نفس کو قابو میں لانے کا بہترین ذریعہ ہے، اور اس وقت جو بات کی جائے وہ سیدھی دل میں اُترتی ہے۔ لہٰذا اس وقت قرآن حکیم کو ٹھہر ٹھہر کر ترتیل کے ساتھ پڑھنا چاہیے تاکہ اُس کے معانی اور مطالب دل میں اُترتے چلے جائیں۔

پھر اس وقت اللہ کی رحمت بھی متوجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ آدمی اپنے لئے یا خلق کی بھلائی کے لئے جو دُعائیں مانگتا ہے وہ مقبول ہوتی ہیں

ان ہدایات کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نصف شب یا اُس سے کم وبیش قیام اللیل کی پابندی کرتے تھے، جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے قدم بعض دفعہ متورم ہو جاتے تھے:

قیام اللیل کے اسی حکم پر عمل کرنے کے انداز کے بارے میں خود قرآن شہادت دیتا ہے کہ:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۝	یقیناً تمہارا رب جانتا ہے کہ تم رات کی دو تہائی یا اُس کا نصف یا اُس کی ایک تہائی اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوتے ہو اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک جماعت اس قیام میں تمہاری شریک ہے۔

دعوتِ حق کے ساتھ یہ قیام اللیل بے حد لازمی شے ہے۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالےٰ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے۔ لیڈری اور مشیخت جمانے کے بجائے تواضع اور شکرِ نعمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنی طلاقتِ لسانی اور کوششوں پر اعتماد کرنے کے بجائے اللہ تعالےٰ کی نصرت اور تائید پر اعتماد بڑھتا ہے۔ بندہ رات کو دعا کرتا ہے، دن کو اس کی قبولیت کا مشاہدہ کرتا ہے، لذتِ آہ سحر گاہی سے آشنا ہوتا ہے، ندامت کے آنسوؤں سے کوتاہیوں کے داغ دھوتا ہے، اور نام ونمود کی بجائے اصل مقصود یعنی رضائے الٰہی پر نگاہیں مرکوز کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پس اہل دعوت کے لئے قیام اللیل وہ غذا ہے جس سے وہ کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

تبلیغِ دین

(آداب اور شرائط)

مکّہ معظمہ میں اللہ تعالےٰ نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو جو ذمّہ داریاں سپرد کی تھیں ان میں سے سب سے اہم ذمّہ داری تبلیغ دین کی ذمہ داری تھی۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

تبلیغِ دین میں آنحضرتؐ کی سرگرمی

یٰاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ

"اے نبیؐ! تمہارے رب کی طرف سے جو چیز تمہاری طرف اتاری گئی ہے اسے (لوگوں تک) پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کا پیغام نہ پہنچایا۔"

آنحضرتؐ اس حکم کی تعمیل میں بیحد سرگرم رہتے تھے۔ آپ نے نبوت کے ابتدائی ۶ – ۷ برسوں میں مکہ کے ہر گھر تک اسلام کی دعوت پہنچا دی تھی۔ یہی نہیں بلکہ مکّہ میں جو ممتاز شخص کسی بھی کام سے آتا آپ اس کے

پاس پہنچ کر اس کو دعوت دیتے ۔ ابن ہشام کا بیان ہے ۔

وھو لا یسمع بقدم یقدم مکۃ من العرب لہ اسم و شرف الا تصدی لہ فدعاہ الی اللہ و عرض علیہ ما عندہ ۔

یعنی مکہ میں جب بھی آپ کو کسی ممتاز شخص کے آنے کی اطلاع ملتی آپ اس سے ضرور ملاقات کرتے اس کو اللہ تعالےٰ کی طرف دعوت دیتے اور آپ کے پاس جو پیغام تھا وہ اسکے سامنے پیش کرتے ۔

پھر حج کے موسم میں جو قبائل عرب حج کے لئے آتے آپ ان میں سے ایک ایک کے پاس بالخصوص ان کے سرداروں کے پاس جاتے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے اور اسلام کی دعوت کو پھیلانے کے لئے ان سے کہتے کہ تم اپنے قبیلے کو مرکز بنانے پر راضی ہو جاؤ ۔

تمام انبیاء کی دعوت کی طرح آپ کے اوّلین مخاطب بھی ہمیشہ ممتاز اصحاب، سرداران قبیلہ اور سمجھدار افراد ہوتے تھے ۔ فساد انگیز تحریکوں کی طرح آپنے مقلد قسم کے عامۃ الناس کو بہلا پھسلا کر اپنے پیچھے لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی ۔

مکہ سے مایوس ہو کر آپ ایک بار طائف گئے جو اس زمانے میں عرب کا دوسرا اہم شہر تھا وہاں بھی آپ نے صرف سرداران قبیلہ سے ملاقات کی دعوت کے بارے میں آپ کی سرگرمی اور محنت کا اندازہ خود قرآن مجید ہی سے ہو جاتا ہے اللہ تعالےٰ نے آپ کی حد سے بڑھی ہوئی سرگرمی کو دیکھ کر متعدد بار فرمایا :

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ (اے نبیؐ) شاید آپ

آپ ان کے پیچھے اپنی جان دیدیں گے کبھی حضورؐ کو اطمینان دلانے کے لئے ارشاد فرمایا ۔

لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۔ (اے نبی) آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ آپ ان کو ضرور ہدایت پر لے آئیں ۔ یہ تو اللہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۔

مداہنت جائز نہیں

تبلیغ کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ درحقیقت آپ کے واسطے سے اہل ایمان کو بار بار تاکید کی گئی کہ تم اپنی دعوت میں کوئی مداہنت، نرمی یا کمی بیشی ہرگز ہرگز نہ کرو ۔ جو پیغام تم کو ملا ہے اس کو بے کم و کاست پہنچا دو ۔ اور اس سلسلہ میں کسی کے ناراض ہونے کی قطعاً پرواہ نہ کرو ۔

انسان نیک نیتی کے ساتھ بعض دفعہ یہ سوچتا ہے کہ اگر مخاطب کے عقیدہ اور خیال پر میں نے کھل کر تنقید کر دی تو وہ متنفر ہو جائے گا ۔ اور میری بات سننے کا روادار ہی نہ ہو گا ۔ اس لئے بات اس طرح کی جائے کہ مخاطب متنفر نہ ہو بلکہ یہ سمجھے کہ میرے اور داعی کے خیالات میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے ۔

اسلامی دعوت کے لئے یہ مداہنت اور یہ جھوٹی رواداری بہت بڑا خطرہ ہے اسی لئے قرآن مجید نے اس کو اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے ۔

مثلاً سورۃ ہود میں ارشاد

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا

اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۔

پس جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اس پر جمے رہیے اور جو لوگ آپ کے ساتھ اسی طریقے کی طرف پلٹ کر آتے ہیں وہ بھی جمے رہیں اور مقر حد سے ذرا آگے نہ بڑھو تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ تعالے اس سے باخبر ہے ۔ اور مشرکین کی طرف ذرا نہ جھکو ورنہ (جہنم کی) آگ تم کو آلے گی ۔

ایک اور موقعہ پر فرمایا ۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ان مشرکین کی خواہش ہے کہ آپ ذرا مداہنت کریں تو وہ بھی مداہنت کریں ۔

ترمیم کا اختیار نہیں

ایک جگہ مشرکین کا یہ مطالبہ بیان کیا گیا ہے کہ ؛

اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ

وہ کہتے ہیں اس قرآن کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس میں (کچھ) ترمیم کر دو ۔

اس کے جواب میں کہا گیا :

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ

کہدیجئے مجھے اس کا حق نہیں پہنچتا کہ میں اس کے اندر اپنی طرف کوئی تبدیلی کردوں ۔

مصالحت روا نہیں

دعوت و تبلیغ میں آنحضرتؐ نے ان ہدایات پر سختی کے ساتھ عمل کیا اور مشرکین کی جانب سے آپ کو نرمی، مداہنت اور مصالحت کی جتنی بھی دعوتیں دی گئیں ان سب کو

آپ نے قطعاً ٹھکرا دیا ۔

بہت سارے واقعات میں سے یہ واقعہ خاص طور لائق توجہ ہے کہ جب جناب ابُوطالب کا آخری وقت آیا تو قریش نے یہ سوچ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واحد سہارا ہی ابو طالب تھے اس لئے اُنکی موت سے محمدؐ بہت پریشان ہوں گے ۔ اور یہ وہ نفسیاتی موقعہ ہے جب محمدؐ کو جھکا لینا مشکل نہ ہوگا ۔

چنانچہ قریش کے بڑے بڑے سردار ابوطالب کے پاس آئے اور کہا کہ دیکھئے آپ کا آخری وقت ہے آپ کو معلوم ہے کہ ہماری آپکے بھتیجہ کے ساتھ سخت مخالفت چل رہی ہے ۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ آپ اُس کو بلوائیں اور اسکو مجبور کریں کہ وہ کچھ ہماری باتیں مان لے کچھ ہم اس کی باتیں مان لیں تاکہ وہ ہم سے باز رہے ہم اُس سے باز رہیں وہ ہم کو ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اس کو اس کے دین پر عمل کرنے کی آزادی دیدیں ۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا گیا ۔ جناب ابو طالب نے قریش کے سرداروں کا مطالبہ آپ کے سامنے بیان کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا میں تو ان سے صرف ایک بات کا مطالبہ کرتا ہوں اور اگر وہ یہ بات مان لیں تو تمام عرب و عجم ان کے سامنے جھک جائے گا ۔ ابوجہل نے کہا جی ہم تو آپ کی دس باتیں ماننے کو تیار ہیں ۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ بس پھر کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لو اور تمہارے باپ دادا جن بتوں کو پوجتے آئے ہیں ان کو چھوڑ دو، یہ سُن کر قریش کے سرداروں نے کہا کہ یہ شخص کسی طرح بھی سودے بازی پر راضی نہیں ہو سکتا ۔ چلو واپس چلیں ۔

عالمی دعوت، قومی اور وقتی مسائل کی متحمل نہیں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ابتدا ہی سے معلوم تھی کہ آپ کی دعوت تمام عالم کے لئے ہے۔ محض قریش کے لئے یا محض عرب کے لئے نہیں ہے۔ اور آپ جس پیغام کو لے کر آئے ہیں وہ کسی ایک قوم یا ملک یا زمانے کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک عالمی دعوت ہے، جو زمان و مکان کی قید سے ناآشنا ہے۔ خود اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَکُوْنَ لِلْعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا۔

وہ ہستی بہت برکت والی ہے جس نے فرقان (قرآن) کو اپنے بندے پر نازل کیا ہے تاکہ وہ تمام قوموں اور جہانوں کے لئے ڈرانے والا بن جائے۔

اس وجہ سے آپ نے اپنی نگاہ کو ہمیشہ بلند رکھا اور مختلف مواقع پر اپنے خطبوں میں اس حقیقت کو واضح بھی کر دیا۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا:
وَاللّٰهِ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ خَاصَّةً وَّاِلَی النَّاسِ کَافَّةً۔

خدا کی قسم میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف خاص طور پر اور تمام انسانوں کی طرف عام طور پر۔

چنانچہ مقامی جھگڑوں یا قومی اور قبائلی مسئلوں میں آپ نے الجھنا کبھی پسند نہ فرمایا کیونکہ دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو ان امور سے بلند تر ہونا چاہیئے۔

حضورؐ نے عالمی دعوت کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد تمام قبائل عرب، اور عرب کے متصل واقع تمام چھوٹی بڑی حکومتوں کے سربراہوں کو اسلام کی دعوت پہنچائی اور اس سلسلہ میں کئی سو خطوط لکھوائے۔

پھر سب سے آخر میں آپ نے میدان عرفات میں ایک لاکھ سے زائد مجمع کو خطاب کرتے ہوئے حجۃ الوداع کے موقع پر حاضرین سے دریافت کیا۔

الا ھل بلغت : سنو! کیا میں نے پہنچا دیا؟ تبلیغ کا فرض انجام دیدیا؟؟ اور جب سب نے بالاتفاق اثبات میں جواب دیا تو آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر اور پھر مجمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا؛ اللّٰھم اشھد !!! اے اللہ تو گواہ رہیو!!! اس طرح تبلیغ کو جو ذمہ داری اللہ تعالےٰ نے آپ پر ڈالی تھی وہ آپ نے پوری کر دی۔

اہل ایمان کی تنظیم و تربیت

دعوت کو قبول کرنے اور رد کرنے والے

دعوت و تبلیغ کے فریضے کو ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خوبی سے انجام دیا اس کے نتیجے میں معاشرہ کے صالح نوجوانوں میں سے ایک جماعت آگے بڑھی، یہ لوگ آنحضرتؐ پر ایمان لائے اور آپ کے متبع بن گئے۔

اسی طرح کچھ دوسرے لوگ اس دعوت کی مخالفت اور آنحضرتؐ کے ساتھ دشمنی کرنے پر تل گئے۔

ان دو انتہاؤں کے درمیان عام لوگ اس دعوت کی تائید یا مخالفت کے سلسلہ میں بے شمار مختلف درجات میں منقسم ہو گئے۔ کوئی ماننے والوں کے قریب تھا کوئی دور، اسی طرح کوئی دشمنی رکھنے والوں سے قریب تھا اور کوئی غیر جانبدار بن کر کشمکش کے نتیجہ کا منتظر تھا، کوئی غفلت اور جہالت میں مبتلا ہونے کے باعث دعوت سے بالکل ناواقف تھا۔

ان مختلف قسم کے گروہوں اور جماعتوں کے ساتھ مناسب طرز عمل اختیار کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو

ہدایات دیں اور آنحضرتؐ نے ان گروہوں میں سے ہر ایک کے ساتھ وحیٔ الٰہی کی روشنی میں معاملہ کیا۔

ایمان لانے والوں کے ساتھ معاملہ

ایمان لانے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ہدایات دی تھیں ان میں سے ایک ایک کو سامنے رکھیئے اور ان کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرتے چلے جایئے،

شفقت و رحمت

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی تھی: "وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ" ایمان لانے والوں کے لئے اپنے بازؤں کو جھکا دو!

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ"،

ایمان لانے والوں میں سے جن لوگوں نے آپ کی پیروی کی ہے ان کے لئے اپنے بازوؤں کو جھکا دو۔

ان ہدایات کا مطلب یہ تھا کہ ایمان لانے والے لوگ معاشرے میں جب ہر طرف سے ٹھکرائے اور ستائے جا رہے ہیں تو اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے آغوش شفقت میں ان کو پناہ ملنی چاہیئے۔ تاکہ وہ آپ کی رحمت و شفقت اور آپ کی غمگساری اور دلداری سے وہ قوت حاصل کر سکیں جو اس مخالفانہ ماحول سے مقابلہ کے لئے درکار تھی۔

آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت پر سختی کے ساتھ عمل کیا، ایک ایک ایمان لانے والے کے ساتھ آپکا انفرادی رابطہ قائم تھا،

ہر مصیبت اور ہر تکلیف میں آپؐ ان کی دلداری کرنے کے لئے خود ہر ایک کے پاس پہنچتے تھے اس کے علاوہ آپؐ نے حضرت ارقم ابن ابی ارقم کے گھر کو اپنا مستقل مرکز بنا لیا تھا جہاں پر ایمان لانے والے لوگ ہمہ وقت آپ کے پاس موجود رہتے تھے، کچھ لوگ اگر ضرورتاً باہر جاتے تو کچھ دوسرے لوگ اپنے اپنے کام کر کے واپس آجاتے تھے۔

اساسِ تنظیم۔ شفقت و رحمت

آنحضرتؐ کی اس شفقت اور رحمت، نصبُ العین کی وحدت اور اہلِ جاہلیت کے ساتھ کشمکش کی وجہ سے یہ ایمان لانے والے لوگ فطری طور پر ایک مضبوط تنظیم کی شکل اختیار کرتے چلے گئے جس میں آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی کو مرکزیت کا مقام حاصل تھا۔

چنانچہ قرآن مجید خود شہادت دیتا ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ"

پس اللہ کی رحمت ہی کی وجہ سے آپ ان کے لئے نرم خو بن گئے، اور اگر آپ بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ

اہل ایمان کی فطری تنظیم کے بارے میں آنحضرتؐ کو دوسری ہدایت یہ تھی کہ آپ ان کے ایمان کو مستحکم کریں۔ ان کا تزکیہ کریں اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیں چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اس ہدایت کو خبر دینے کے انداز میں یوں بیان فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۔

وہی ہے جس نے امیین میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

آیاتِ الٰہی کی اقسام

اللہ تعالےٰ کی آیات کی دو قسمیں ہیں ایک وہ آیات ہیں جو کتاب الٰہی کا جزو ہیں، دوسری وہ آیات ہیں جو آفاق کائنات اور نفس انسانی میں جلوہ گر ہونے کے باعث کتاب فطرت کا جزو ہیں۔

یہ دونوں قسم کی آیات ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے استحکام کا ذریعہ ہیں۔

قرآن مجید نے کتاب الٰہی کی آیات کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

"وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا"

"اور جب ان کو ہماری آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیات ان کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں۔"

اسی طرح آفاق اور انفس کی آیات کے بارے میں ارشاد ہے:

"سَنُرِيْهِمْ اٰيَاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ"

ہم ان کو اپنی آیات آفاق کائنات میں اور خود ان کے نفوس کے اندر دکھائیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے لئے یہ بات کھل جائے گی کہ وہی

حق ہے لیکن آفاق اور انفس کی آیات اسی وقت ایمان میں اضافے کا موجب بنتی ہیں جب ان کو کتابِ الٰہی کی آیات کی روشنی میں دیکھا جائے۔

منبع ایمان - قرآن کے ساتھ شغف

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی تقویت اور استحکام کے لئے کتاب اللہ کی آیات اہل ایمان کو پڑھ کر سناتے تھے وہ ان کو آنحضرت سے یاد کرکے دوسروں تک پہنچاتے تھے اپنی نمازوں میں انکو دھراتے تھے اور ان کو بکثرت پڑھ کر حلاوت ایمان کا مزا لیتے تھے، راتوں کی تنہائیوں میں نماز تہجد کے اندر انکی تلاوت کرکے اپنے قلب و روح کو ایمان کی روشنی سے منور کرتے تھے اور جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ آنحضرت اور اہل ایمان میں تلاوت آیات کا یہ شغف اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس میں قدرے تخفیف کی ہدایت فرمائی:

"اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ"

"یقیناً آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ رات کے دو تہائی اور اس کا نصف اور اس کا ایک تہائی قیام کرتے ہیں اور مومنوں میں ایک گروہ جو آپ کے ساتھ ہے وہ بھی (قیام کرتے ہیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کا ایک اندازہ مقرر فرما دیا ہے اس کو معلوم ہے کہ تم اس عمل کو قائم نہ رکھ سکوگے

پس اس نے تم پر نظرِ رحمت فرمائی تو اب تم قرآن میں سے اتنا پڑھو جتنا باسانی پڑھ سکتے ہو۔

تزکیہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا کام یہ تھا کہ آپ اہلِ ایمان کا تزکیہ فرمائیں یعنی عقائد و افکار اور اعمال اور اخلاق میں سے جاہلیت کی باتوں کو چن چن کر خارج کریں اور ان کی جگہ اسلامی تعلیمات اور اسلامی اعمال و اخلاق کو جاری فرمائیں اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی تھی:

"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا"

"اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھو جو صبح و شام اپنے رب کو راضی کرنے کے لئے اس کو پکارتے ہیں اور دنیا کی زینت کی طلب میں اپنی نگاہوں کو دوسروں پر نہ ڈالو"

مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے والوں کی تربیت کو مقدم رکھو اور دعوت کو پھیلانے سے زیادہ جن لوگوں کے دلوں میں دعوت کے بیج نے جڑ پکڑ لی ہے ان کی آبیاری اور نشوونما کو مقدم رکھو اسی ہدایت کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ ایمان لے آنے والا ایک غریب نابینا قریش کے متکبرین سے زیادہ آپکی توجہ کا مستحق ہے، کیونکہ:

"وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ" "آپکو کیا خبر شاید وہ تزکیہ حاصل

"تَزَکّٰی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی" کرے یا اسے نصیحت حاصل ہو جائے تو اس کو نصیحت کرنا فائدہ مند ثابت ہو۔"

شرک اور اہل شرک سے اجتناب

تزکیہ ہی کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی:

وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ ۔ اور تم شرک کرنے والوں کی طرف نہ جھکو (نہ عقائد میں نہ اعمال میں) ورنہ تم کو آگ (جہنم) آلے گی۔

اس ہدایت کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والے شرک اور مظاہر شرک سے مکمل طورا جتناب کرتے تھے اور کسی ایسی چیز کو قطعًا گوارا نہ کرتے تھے جس میں شرک کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔

صبر اور ضبط نفس

اسی تربیت اور تزکیہ کا ایک جزو یہ تھا کہ دعوت پہنچانے میں تو کوئی مداہنت نہ کرو۔ لیکن اگر تشدد کیا جاتے تو صبر سے کام لو اور تشدد برداشت کرنے کی قوت نماز اور تعلق باللہ سے حاصل کرو۔

"کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" "اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کو تمام آداب و شرائط کیساتھ قائم کرو۔"

یہی نہیں بلکہ حکم یہ تھا کہ جس مرحلے کے لئے جو ہدایات دی جاتی ہیں ان پر سختی سے عمل کرو اور آگے کے مرحلے کی بات نہ کرو۔

"فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَکَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ" "پس تم راستی کے ساتھ جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے اور جو لوگ تمہارے ساتھ اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے ہیں (وہ بھی جمے رہیں) اور حد سے آگے نہ بڑھو جو کچھ تم کرتے ہو بیشک وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔"

جاہلیت کے اس معاشرے میں جہاں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا مردانگی کا نشان تھا وہاں صبر و درگزر کے ان احکام پر عمل کرنا آسان نہ تھا لیکن دعوت اسلامی کا یہ مرحلہ اسی صبر و ضبط کا طالب تھا چنانچہ ابو بکر صدیقؓ، علی مرتضیٰؓ، عمر فاروقؓ اور حضرت حمزہؓ جیسے صاحب غیرت و شہامت صحابہ نے یہ مرحلہ نہایت صبر کے ساتھ گزار دیا رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

اس تزکیہ کے ساتھ صحابہ کرامؓ میں سے ہر شخص کو اسکی استعداد کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اور حکمت کی تعلیم بھی دیتے تھے اس طرح ان کے اندر فہم کتاب اور تفقہ فی الدین کی وہ صلاحیتیں نشوونما پا رہی تھیں جن کے ذریعہ عرب کے ان بادیہ نشینوں نے کسریٰ اور قیصر کی متمدن سلطنتوں کے کھنڈر پر اسلامی ریاست کی عالیشان اور عدیم المثال تعمیر کی نقشہ گری کی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

داعی اور اس کے معاندین

معاندین کا منفی اتحاد

تبلیغ و دعوت کے نتیجہ میں ایمان لانے والوں کی جماعت کے ساتھ ساتھ مخالفت کرنے والوں کا بھی ایک جتھا بنتا چلا گیا۔ یہ لوگ اگرچہ اہل ایمان کی طرح ایک جماعت کی صورت میں ابتداءً منظم و متحد تو نہ تھے لیکن اسلام دشمنی کے باعث اور جاہلیت سے محبت کی وجہ سے جاہلی قبائلی نظام کے تحت رفتہ رفتہ وہ بھی اسلام کی دعوت کو مٹانے کے لئے منظم اور متحد ہوتے چلے گئے۔

ان مخالفین اور معاندین کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو واضح ہدایات دیں اور اللہ کے رسُول نے ان ہدایات پر پورے طور پر عمل کیا۔

مداہنت سے اجتناب کے فائدے

ان ہدایات میں سے پہلی ہدایت یہ تھی کہ مخالفت کے ڈر سے دعوتِ اسلامی کو پیش کرنے میں اور اس کے تقاضوں کو واضح کرنے میں ذرا بھی مداہنت نہ برتی جائے اس ہدایت پر عمل درآمد کی تفصیل کو فریضۂ دعوت و تبلیغ کی ادائیگی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے واضح کیا جا چکا ہے۔

دعوت کو بلا مداہنت اور صاف صاف پیش کرنے کی وجہ سے ایک طرف دعوت کے تمام بنیادی پہلو نکھر کر سامنے آتے چلے گئے، دوسری طرف مخالفین کی مخالفت میں شدّت پیدا ہوتی چلی گئی اس مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان لانے والوں کے خلوص کی آزمائش اور عزم و ارادے کو پختہ تر کرنے کے لئے قدرتی حالات پیدا ہوتے چلے گئے۔

ضبط نفس اور صبر کی حکمتیں

دوسری ہدایت یہ تھی کہ ایمان لانے والے گالی کا جواب تشدد سے نہ دیں بلکہ صبر سے کام لیں اور اپنی زبان اور اپنے ہاتھ کو روکے رکھیں۔

چنانچہ ارشاد ہے:

"وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ"

"یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں انکو گالیاں نہ دو"

اسی طرح ارشاد ہے:

"کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" "اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کو تمام آداب و شرائط کے ساتھ قائم کرو"

یہ ہدایت اس پس منظر کو بیان کرتے ہوئے دی گئی کہ تم سے پہلے جو لوگ دعوت اسلامی کے علمبردار تھے وہ تشدد کا مقابلہ کرنے کیلئے قوّت کے استعمال کی اجازت کے لئے جلدی کیا کرتے تھے۔ لیکن جب ان کو ہتھیار سنبھالنے کا حکم دیا گیا تو وہ کہنے لگے کہ ابھی تو ہم پوری طرح تیار نہ تھے قتال کی فرضیت ابھی اور مؤخر کی جاتی تو بہتر ہوتا۔

اس طرح مکہ کے مظلوم لیکن بہادر اور پُرعزم اہل ایمان کو بتایا گیا کہ

تمہاری انفرادی شجاعت اور غیرت مسلّم لیکن جماعتی حالات جب تک سازگار نہ ہوں اس وقت تک تشدّد کا جواب دینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اللہ تعالیٰ نے خود نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ"	"پس تم صبر کرو جس طرح (تم سے قبل) صاحب عزم رسول صبر کرتے چلے آئے ہیں اور ان کے لئے جلدی نہ کرو۔"

اس ہدایت پر سختی کے ساتھ عمل کرنے سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ باطل کے ساتھ مسلح تصادم قبل از وقت شروع کرانے کی سازش کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ کفار میں سے معاندین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح جارح ثابت کر دیا جائے تاکہ ان کو یکبارگی تشدّد کے ذریعہ ختم کر دینے کا بہانہ ہاتھ آجائے لیکن مسلمانوں نے اللہ تعالےٰ کی ہدایت کے مطابق جب طاقت کا استعمال نہیں کیا تو ان کے خلاف ہتھیار اٹھاتے میں کفارِ قریش کو یہ اندیشہ مانع رہا کہ مقتول مسلمانوں کے اہل قبیلہ کافر بھی کہیں انکی حمایت میں کھڑے نہ ہو جائیں، کفر و اسلام کا لحاظ کئے بغیر کہیں قبائلی جنگ کا آغاز نہ ہو جائے۔

اس ہدایت پر عمل کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے سخت ناگوار حالات میں بھی نظم جماعت کی پابندی کرنے کی تربیت حاصل کی۔ تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اندر کفر کے خلاف نبرد آزما ہونے کا داعیہ قوی

سے قوی تر ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ جب ان کو ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا گیا تو اس وقت ان میں سے ہر شخص نے یہ سمجھا کہ یہ حکم کہیں باہر سے نہیں آیا ہے بلکہ ان کے اپنے داخلی مطالبے کی تکمیل ہے۔

چوتھا فائدہ یہ ہوا کہ معاشرہ کے اندر جن لوگوں کے ضمیر میں ذرا سی بھی انسانیت کی رمق موجود تھی وہ ان مظلوموں کی حالت دیکھ کر آہستہ آہستہ دعوت اسلامی کی طرف کھینچتے چلے گئے۔ ظلم و ستم سہنے کے اسباب کا کھوج لگاتے لگاتے وہ دعوتِ اسلامی کی حقانیت کے قائل ہو گئے۔ چنانچہ اس طرح معاشرہ کے صالح افراد چھنٹ چھنٹ کر اہل ایمان کی جماعت میں شامل ہوتے چلے گئے۔

معاشرتی روابط قائم رکھو

مخالفین اور معاندین سے مقابلہ کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے تیسری ہدایت یہ فرمائی کہ گھر کے بڑے بوڑھوں کے ساتھ نوجوان اہل ایمان احسان اور اطاعت کا طرزِ عمل اختیار کریں، لیکن شرک میں یا اللہ تعالےٰ کی نافرمانی میں ہرگز ہرگز انکی بات نہ مانیں۔

"وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا" "ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ وہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔"

پھر سورہ لقمان میں اسی جیسی ہدایت کے بعد ارشاد ہے:

"وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا"

"لیکن اگر وہ تجھ سے اس بات پر اصرار کریں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک کر جس کے بارے میں تجھے علم نہیں پس تو ان کی اطاعت نہ کر البتہ

دنیا میں ان کے ساتھ بھلے طریقے رہتا رہ"۔

معاشی روابط قائم رکھنے کی حکمتیں

اس ہدایت میں حکمت یہ تھی کہ ابھی تک معاشرے میں سے صالح افراد کو چھانٹنے کا عمل چونکہ جاری ہے لہذا اگر ایسے وقت میں اہل ایمان قطع تعلق کا طریقہ اختیار کر لیں گے تو دعوت کے پھیلنے کا کام رک جاتے گا اور کفار پر اتمام حجت نہ ہو سکے گی۔

اس ہدایت سے ایک زبردست فائدہ یہ بھی ہوا کہ اہل ایمان کو ذاتی انتقام لینے کے جذبے سے بچنے کی تربیت ملی وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتے رہے جو ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔

غالباً انہیں حالات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

"امرنی ربی بتسع اوصیکم بھا خشیۃ اللّٰہ فی السر والعلانیۃ وکلمۃ العدل فی الغضب والرضا والقصد فی الفقر والغنا وان اصل من قطعنی واعطی من حرمنی واعفو عمن ظلمنی وان یکون صمتی فکراً ونطقی ذکراً ونظری عبراً۔

"میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا جن کی میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ باطن اور ظاہر میں اللہ سے ڈرنا، ناخوشی اور خوشی میں انصاف کی بات کہنا، غریبی اور امیری میں میانہ روی اختیار کرنا، اور یہ کہ میں اس سے جڑوں جو مجھ سے کٹے اور اس کو دوں جو مجھ کو محروم رکھے اور اس کو معاف کر دوں جو مجھ پر ظلم کرے اور یہ کہ میری خاموشی تفکر ہو میرا بولنا تذکر ہو اور میری نگاہ نگاہ عبرت ہو۔"

کج بحثی سے اجتناب

مخالفین اور معاندین سے مقابلہ کرنے کے لئے چوتھی ہدایت یہ دی گئی کہ ان کے ساتھ کج بحثی میں نہ الجھو ہاں اگر کوئی معقول شبہہ یا اعتراض ہو تو اس کا جواب دیدو لیکن جب مخاطب جہالت اور ضد پر اتر آئیں تو سلامتی کی بات کہہ کر ان سے جدا ہو جاؤ۔

"وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا" اور جب نادان لوگ (اپنی نادانی کے ساتھ) ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہتے ہیں۔

اس کی بہترین مثال وہ ہے واقعہ جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ کفار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم تو جب ایمان لائیں گے۔ جب آپ زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دکھائیں یا آپ کے پاس کھجور اور انگور کے باغ ہوں، آپ کا مکان سونے کا بن جاتے یا آپ آسمان چڑھ جائیں وغیرہ وغیرہ ان سب کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ تھا۔

"هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا" "میں تو محض ایک بشر رسول ہوں"

کج بحثی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے اندر ہٹ دھرمی پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ معقول سے معقول بات بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اسی لئے حکم دیا گیا ہے کہ:

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ"

"اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ اور ان سے ایسے طریقہ پر بحث کرو جو بہتر سے بہتر ہو"

اس ہدایت پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضنے سختی کے ساتھ عمل کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دعوت اسلامی غیر ضروری بحثوں میں اُلجھنے سے محفوظ رہی اور مفت کی دشمنیاں بھی نہ بڑھیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مقاومت کے طریقے

تین سال تک خفیہ دعوت اور دو سال تک علانیہ دعوت کے مرحلوں سے گزر کر نبوت کے پانچویں سال اسلامی دعوت تیسرے مرحلے میں داخل ہو گئی تھی اس مرحلے میں مسلمانوں پر بالعموم اور ان میں سے ضعفاء پر بالخصوص کفار قریش نے ظلم وستم کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیتے تھے، جب یہ مظالم بہت سے مسلمانوں کی قوت برداشت سے گذر گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گردوپیش کا جائزہ لیکر مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔

ہجرت حبشہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مشورہ سورۂ عنکبوت کی اس آیت کی روشنی میں دیا تھا:

"یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ"

اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین کشادہ ہے تو تم صرف میری عبادت کرو۔"

مطلب یہ تھا کہ اگر مکہ کی سرزمین تمہارے لئے تنگ کر دی گئی ہے تو کیا ہوا دُنیا کے کسی اور خطے کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں تم کو اللہ کی

بندگی بجا لانے کی آزادی حاصل ہو۔

اس آیت کے بعد والی آیتوں میں واضح کیا گیا ہے کہ موت سے نہ ڈرو وہ اپنے وقت پر آئے گی اور نہ رزق کی فکر کرو کیونکہ جو اللہ تعالیٰ دوسرے جانداروں کو رزق پہنچا رہا ہے وہی تم کو بھی رزق فراہم کریگا۔

مسیحیوں کو دعوت پہنچانے کا طریقہ

چونکہ حبشہ میں ایک ایسی عیسائی حکومت قائم تھی جس میں مذہبی طبقہ کو بہت اثر ورسوخ حاصل تھا اور مسلمانوں کو ہجرت کر کے وہاں جانا تھا اس لئے اسی سُورۃ عنکبوت میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کو مفصل طور پر بتایا گیا کہ اہل کتاب کو تم اسلام کی دعوت کس طرح پہنچاؤ:

"وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ
الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ
هِیَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا
الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا
مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا
بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا
وَ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَ
اِلٰهُنَا وَ اِلٰهُكُمْ
وَاحِدٌ"

"اور اہل کتاب سے بحث نہ
کرو مگر اچھے طریقے پر ہاں
ان میں سے جو ظالم ہیں،
(انکی بات دوسری ہے)
اور کہو کہ ہم ایمان لائے اُس
چیز پر جو ہماری طرف نازل
کی گئی اور جو تمہاری طرف
نازل کی گئی ہمارا معبود اور
تمہارا معبود ایک ہی ہے"

اسی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے سُورۃ مریم نازل فرمائی جس میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تاریخی پس منظر کی وضاحت کے ساتھ اسلامی عقیدے

کو مفصّل طور پر بیان کیا گیا ہے اور نہایت دلنشین طور پر بتایا گیا ہے کہ سیّدنا مسیح علیہ السّلام کا اصل مرتبہ کیا ہے؟

یہ سورت گویا مہاجرین حبشہ کے لئے زادِ راہ اور توشۂ سفر کی حیثیّت میں ان کے ساتھ کر دی گئی تھی۔

حبشہ کی طرف جو لوگ ہجرت کر کے گئے ان کی مجموعی تعداد ۱۰۱ تک پہنچ گئی جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکّہ میں رہ جانے والے مسلمانوں کی تعداد صرف چالیس کے لگ بھگ رہ گئی تھی۔

ہجرت حبشہ کا ردعمل

اس ہجرت کے باعث مکّے کے گھر گھر میں صف ماتم بچھ گئی تھی کیونکہ ہر گھر کا کوئی نہ کوئی نوجوان مکہ چھوڑ کر حبشہ کی طرف چلا گیا تھا کسی کا بیٹا، کسی کی بیٹی، کسی کا بھائی اور کسی کا داماد خاندان سے کٹ کر دور جا بسا تھا۔

قریش نے ان مہاجرین کو واپس لانے کے لاکھ جتن کئے بادشاہِ حبشہ کے پاس اپنی سفارت، بڑے بڑے تحفے تحائف کے ساتھ بھیجی لیکن ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

ان حالات کی وجہ سے کفار کا غیظ و غضب بہت زیادہ بڑھ گیا تھا وہ اپنی ساری بدبختی کا ذمّہ دار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھتے تھے اس لئے اب وہ آپ کا مذاق اڑانے اور بے تکے اعتراضات کرنے سے آگے بڑھ کر بُرا بھلا کہنے بد دُعائیں دینے اور نعوذ باللہ آپ کو قتل کرنے کی سازشیں بھی سوچنے لگے تھے۔

الزامات اور اعتراضات کا طوفان

لیکن آپ کی ذاتی وجاہت۔ خاندان ہاشم کی سیاسی

قوت اور سب سے بڑھ کر خود اللہ تعالےٰ کی حفاظت کے باعث ان کو یہ جرأت تو نہ ہو سکی کہ وہ آنحضرتؐ کو اس طرح اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائیں جس طرح وہ دیگر مسلمانوں پر تشدد کیا کرتے تھے لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر الٹے سیدھے اعتراضات کرتے بے سروپا الزامات لگاتے آپکو اپنی بدزبانی اور طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے نیز دھمکیوں اور بدکلامی سے آپ کی حوصلہ شکنی کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔

ان حالات میں ان کا سب سے زوردار سوال یا اعتراض یہ ہوتا تھا کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو ہمارے جھٹلانے کی وجہ سے ہم پر وہ عذاب کیوں نہیں آجاتا آپ جس سے ہم کو ڈراتے رہتے ہیں :

" وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ "

" اور وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمارے حصے کی شامت قیامت سے پہلے ہی ہم پر آجائے "

ایک اور موقعہ پر کہا :

" اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا "

" آپ اپنے دعویٰ کیمطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر کیوں نہیں ڈھا دیتے یا آپ اللہ تعالےٰ اور فرشتوں کو کیوں سامنے نہیں لے آتے "

اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے پہلی بات تو اصولی طور پر یہ واضح فرمائی :

" وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ "

" ہر امت کے لئے ایک مدت مقرر ہے تو جب ان کی مدت آجائے گی (یعنی سنبھلنے کی مہلت ختم ہو جائے گی) تو یہ ایک گھڑی آگے بڑھ سکیں گے اور نہ پیچھے ہٹ سکیں گے "

پھر اس مہلت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب تک اللہ کا رسولؐ کسی قوم کی اصلاح کی کوشش کرتا رہتا ہے اور ان کے اندر موجود رہتا ہے ۔ اس وقت تک اللہ تعالےٰ اس قوم کو اپنے عذاب سے ہلاک نہیں کرتا۔

" وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ "

" اور اللہ تعالےٰ کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ انکو عذاب دے جبکہ اے نبیؐ! تم ان کے اندر موجود ہو ۔ "

صبر و ثبات

ان اصولی وضاحتوں کے علاوہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف طریقوں سے صبر اور ثبات کی ہدایت فرمائی گئی ۔

مثلاً ارشاد ہوا :

" وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ "

" اے نبی! صبر کرو ان باتوں پر جو یہ بناتے ہیں اور یاد کرو ہمارے بندے داؤد کو جو بڑی قوتوں والا تھا بیشک وہ اللہ کی طرف ہی رجوع کرنے والا تھا "

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ"

"پس اے نبی! صبر کرو بیشک اللہ کا وعدہ حق ہے اب خواہ ہم تمہارے سامنے ہی ان کو ان برے نتائج کا کوئی حصّہ دکھا دیں جس سے ہم ان کو ڈرا رہے ہیں یا (اس سے پہلے) تمہیں دُنیا سے اٹھالیں ان کو تو بہرحال ہماری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے"

سُورۃ احقاف میں فرمایا:

"پس اے نبی صبر کرو جس طرح صاحب عزیمت پیغمبروں نے صبر کیا اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو جس روز یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے جس کا ان خوف دلایا جارہا ہے تو ان کو یوں معلوم ہوگا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی سے زیادہ وہ نہیں رہے"

اسی طرح آپکو تسلی دینے کے لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

"قَدْ نَعْلَمُ اِنَّہٗ لَیَحْزُنُکَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّھُمْ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ وَلٰکِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ"

"ہم کو معلوم ہے کہ آپ کو اُس بات سے غم ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں لیکن یہ ظالم آپکو نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں"

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی مایوس کن حالات میں اور سخت اشتعال انگیزی کے باوجود انتہائی صبر اور حوصلے سے کام لیا آپ کو جس قسم کے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑا پھر آپنے جس طرح ان میں صبر سے کام لیا، اس کا اندازہ حضورؐ کے اس ارشاد سے لگایا جاسکتا ہے۔

"اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ وَاَنَا اَشَدُّکُمْ بَلَاءً"

"انسانوں میں سب سے زیادہ جن پر مصیبتیں اور آزمائشیں آتی ہیں وہ انبیاء ہیں پھر ان لوگوں کی باری آتی ہے جو انبیاء سے قریب تر ہوتے ہیں اور مجھے تم سب سے زیادہ آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔"

حضورؐ پر جو مصیبتیں اور آزمائشیں آئیں وہ جسمانی سے زیادہ فکری اور قلبی نوعیت کی تھیں اگرچہ آپکو جسمانی طور پر بھی ستایا گیا لیکن آپ کی اصل آزمائش یہ تھی کہ کفار کی جانب سے آپؐ پر جھوٹے الزامات لگائے جاتے تھے، جاہلانہ اعتراضات کیے جاتے تھے اور کج بحثی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ کبھی کہتے تھے:

"لَوْلَا نُزِّلَ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ"

"یہ قرآن دونوں بستیوں (مکہ اور طائف) کی کسی بڑی ہستی پر کیوں نہیں اتارا گیا"

کبھی کہتے کہ اس نبی کے ساتھ کوئی فرشتہ ہی بھیج دیا جاتا جو اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو خبردار کرتا۔ کبھی آپکو ساحر کہتے۔ کبھی مجنوں اور کاہن قرار دیتے اور کبھی رحمٰن نام کے ایک لوہار کے بارے میں کہتے کہ قرآن حکیم

کی آیات وہی بنا بنا کر آپ کو دیتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں پر آپنے صبر کیا۔ چنانچہ آپ نے نہ مایوس ہوکر اپنا کام چھوڑا۔ نہ لوگوں کے دباؤ سے اس میں کوئی ترمیم قبول کی نہ ناراض ہوکر قبل از وقت اپنے مقام دعوت سے کوچ کیا اور نہ غصہ ہوکر قوم کو بددعائیں دیں بلکہ کہا تو یہی کہا: "اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے وہ جانتے نہیں ہیں۔ فصلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ الی یوم الدین۔

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردو ادب، آپ بیتی، نقد و تجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com